ڈاکٹر عابدہ نسیم ۞

''معتوب'' (امراؤ طارق): ایک تانیثی مطالعہ

***Maatoob* (Umrao Tariq) Feminist Study.**

By *Dr. Abida Naseem, Lecturer, Department of Urdu, University of Sargodha.*

ABSTRACT

Umrao Tariq is a famous fiction writer of our age. *Maatoob* is his important and multi dimentional novel. In this novel, he raised many questions and presented complications of the post modern era. Especially in the feminist perspective, study of this novel is very meaningful. In this article the researcher has tried to analyze various aspects of feminist approach in the novel *Maatoob*. The study has also highlighted the inner crises of the women, which forces her to express herself in various ways. It is also noted that the author has deviated from the prevalling techniques of the writing of this genre and tried to experiment new way to prove his point.

Keywords: Maatoob, Novel, Woman, Feminist, Study.

ہم ایک مابعد جدید عہد میں زندہ ہیں۔ یہ گلوبلائزیشن، لا مرکزیت اور تکثیریت کا عہد ہے۔ کمرشلائزیشن، صنعتی اجارہ داری اور سرمایہ دارانہ تسلط کے ہاتھوں فرد کی بے بسی، انتشار، بے یقینی اور عدم تحفظ کا عہد ہے۔ اس معاشرے کا ہر فرد اور ہر طبقہ بقا کی جنگ میں مصروف ہے اور اس کے لیے ہر حربہ آزمانے پر تلا ہوا ہے اور اس کے باوجود ایک نامعلوم خوف اور اپنی بقا کا خطرہ اس کے سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ وجود کی نایافت، عدم شناخت اور بقا کے اس بحران نے انسان کو طرح طرح کی داخلی پیچیدگیوں، بغاوتوں اور مزاحمتوں پر مائل کر دیا ہے۔ آئے دن کسی نہ کسی عالمی دن کا انعقاد، سیمینار، کانفرنس، مظاہرے، ریلیاں، واک اور ذرائع ابلاغ سب انسان کے انھی مسائل، تحفظات اور خطرات کا اظہار کرنے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ عہد مابعد جدید کے انھی اظہاریوں میں سے ایک اظہاریہ فیمینزم (تانیثیت) کی تحریک بھی ہے۔ یہ

۞ لیکچرر، شعبۂ اردو، سرگودھا یونی ورسٹی

تحریک خواتین کی طرف سے داخلی اور خارجی دباؤ اور گھٹن کے نتیجے میں اپنی بقا کے لیے کی جانے والی کاوش کا نام ہے۔

تانیثیت کا آغاز اٹھارویں صدی کے شروع میں فرانس سے ہوا۔ابتداً اس کی تعریف The advocasy of female rights on the basis of gender equality کے طور پر کی گئی۔(۱) تاہم وقت کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے دائرۂ کار میں خاصی وسعت پیدا کی اور دیگر معاصر تحریکوں سے اثرات قبول کیے جن میں پس ساختیات، ردتشکیل اور مابعد جدیدیت شامل ہیں۔اس طرح ۹۰ء کی دہائی تک آتے آتے اس نے ایک واضح شکل اختیار کر لی۔آکسفورڈ ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز نے تانیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ صدیوں سے جاری مرد حاوی نظریات،مرد حاکمانہ رویوں اور مردوں کی طرف سے ادب میں پیش کیے جانے والے عورت کے تصور اور مردوں کی طرف سے کی گئی شرح وتعبیر پر سوال اٹھاتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ عورت کے طرزِ احساس اور زندگی کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر اور ردِعمل سے متعلق مردوں کی طرف سے طے کردہ روایتی اور مروجہ تصورات کو رد کرتی ہے۔(۲)

عہدِ حاضر کی ادبی صورت حال پر بھی تانیثیت کے بڑے واضح اثرات مرتب ہوئے ہیں۔اردو کے مصنّفین نے بھی تانیثیت کے اثرات قبول کیے ہیں اور یہاں کی ادبی روایت کو از سرِنو دریافت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خواتین مصنّفین کی جانب سے ادب کی نسائی تفہیم کرنے اور ہمارے ادبی اور معاشرتی منظر نامے میں تانیثیت کے نقوش مرتب کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔انیس ہارون اس حوالے سے کہتی ہیں کہ پاکستان میں فیمینزم کا مقصد بنیادی سطح کے حقوق کی جنگ ہے جس میں عورت بحیثیت انسان زندگی گزارنے کا حق مانگ رہی ہے۔وہ اپنی مرضی سے تعلیم، ملازمت اور شادی کرنے کا حق چاہتی ہے۔یہ فیصلہ بھی عورت کا ہی ہونا چاہیے کہ وہ کب اور کتنے بچے پیدا کرنا چاہتی ہے۔(۳)

مندرجہ بالا تعریفات کی روشنی میں تانیثیت کا بنیادی تصور اور اس کا احاطہ کار ہمارے ذہن پر واضح ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ وہ حق ہے جو عورت انسان ہونے کی حیثیت سے معاشرے سے حاصل کرنا چاہتی ہے۔وہ یہ چاہتی ہے کہ اسے محض عورت ہونے کی وجہ سے حقیر نہ سمجھا جائے بلکہ اس کے مکمل وجود کو تسلیم کیا جائے۔ہمارے معاشرے میں عورت کی زندگی کے زیادہ تر فیصلے مرد کرتے ہیں۔وہ عورت کو اپنی مرضی کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں۔مردوں کی طرف سے لکھا گیا ادب بھی انھی معاشرتی اور تہذیبی رویوں سے متاثر ہوتا ہے۔ہماری ادبی روایت میں پیش کی جانے والی عورت بھی ایسے ہی کردار کی مالک ہے جو معاشرے نے اس کے لیے متعین کر دیا ہے۔ادب کی تفہیم وتعبیر میں بھی انھی مخصوص معاشرتی معیارات کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔تانیثیت دراصل انھی رویوں کے خلاف ایک ایسا ردعمل ہے جو عورت کے فکر ونظر کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔اب عورت چاہتی ہے کہ وہ اپنا کردار خود متعین کرے ادب کو اپنے نکتہ نظر سے پڑھے اور اس کی تعبیر کرے،وہ دنیا اور زندگی کو اپنی نظر سے دیکھے اور مردوں کی طرف سے مسلط کیے گئے فیصلے قبول نہ

کرے۔ فہمیدہ ریاض اس حوالے سے کہتی ہیں کہ افسوس تو اس وقت ہوتا ہے جب عورت کی جانب بعض بڑے اور اہم ادیبوں کی نگاہوں میں صرف تاریکی سمائے، وہ صرف اس کا جسم اور بایولوجی دیکھ سکیں اور اس میں چھپے ہوئے انسان تک ان کی نظر کبھی پہنچ ہی نہ پائے۔(۴) اس لیے تانیثیت نے اپنا جو سفر عورت کے مساویانہ حقوق کی جنگ سے کیا تھا اب وہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ پدری نظام میں عورتوں کے تجربات، سماج پر مردوں کی حاکمیت، عورتوں کی زبان بندی، ان کے مسائل کو غیر اہم جاننا، مردوں کی تحریروں کی تنقید، عورتوں کی تحریروں کی توضیح اور عورتوں کے لیے خود مکتفی زبان کی ضرورت سبھی کچھ اب اس کے دائرہ کار میں شامل ہے۔(۵)

ذیل میں امراؤ طارق کے ناول معتوب پر تانیثیت کے اثرات کا مطالعہ کیا جائے گا اور اس کے توسط سے موجودہ دور کی عورت کے مسائل، تحفظات اور معاملات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔ ۴۳۷ صفحات پر مشتمل امراؤ طارق کا یہ ناول ۱۹۹۵ میں منظر عام پر آیا۔ موضوع کے ساتھ ساتھ اپنی تکنیک اور فنی تجربے کی بنا پر بھی یہ ایک اہم اور فکر انگیز ناول ہے۔ موضوعی سطح پر اس میں مصنف نے عہد حاضر کی دگرگوں سیاسی اور سماجی صورت حال کو پیش کیا ہے اور بہت سے سوالات اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ فنی سطح پر بھی اس میں مروجہ روش سے انحراف برتا گیا ہے اور ناول کی روایتی بنت سے ہٹ کر اس میں ایک نیا تجربہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ناول بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصے میں ایک خاتون پادری کے سامنے پیش ہو کر اسے اپنا اعتراف گناہ سننے پر مجبور کرتی ہے۔ اس اعتراف میں فلیش بیک کی مدد سے خاتون کے بچپن کے حالات، تعلیم، شادی، ملازمت، بیرون ملک کا سفر، بیرون ملک سے واپسی، امروز سے ملاقات اور پُراسرار طریقے سے امروز کے قتل کو بیان کیا جاتا ہے۔ قتل کے بیان پر یہ حصہ ختم ہوتا ہے۔ دوسرے حصے میں عالمِ ارواح سے امروز کے مکالمے کے ذریعے اس کے پس منظر اور خاتون سے اس کے تعلق اور پھر قتل پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ تیسرے حصے میں پادری کے توسط سے قتل کا مقدمہ عدالت میں پیش کیا جاتا ہے اور پادری کی کردار کشائی کے ساتھ ساتھ اس حصے میں عدلیہ کی ابتر صورت حال پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے اور عدالت میں بم دھماکے پر یہ حصہ ختم ہوتا ہے۔ اس طرح ناول میں ایک تکونیاتی نسبت قائم کی گئی ہے اور یہ ایک تھری ڈائمینشن فن پارہ بن گیا ہے۔

ناول کا مرکزی کردار ایک عورت ہے۔ یہ کوئی عام عورت نہیں ہے، اسے مقناطیس کی بنی عورت کہا گیا ہے۔ توانا جسم اور پرکشش خدوخال کی حامل اس عورت کا ذہن بھی توانا اور متحرک ہے۔ یہ گوشت پوست کی ایسی سیال عورت ہے جسے زمانے کے تغیرات نے تجربہ کار اور جہاں دیدہ بنا دیا ہے اور وہ دوسروں کو متاثر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ عورت معاشرے کے مروجہ معیار و اقدار پر کاری ضرب لگاتی ہے اور انھیں چیلنج کرتی ہے، خود کو منوانے کی خاطر خودسری کی سطح پر اتر آئی ہے۔ ذیل میں اس عورت کے کردار کو تانیثی تناظر میں مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ ہمارے معاشرے کا ایک عمومی رویہ ہے کہ بعض اوقات مختلف وجوہ کی بنا پر لڑکیوں کی شادی میں بہت تاخیر کر دی جاتی ہے اور انھیں ایک طویل انتظار میں بٹھا دیا جاتا ہے۔مختلف خاندانوں میں اس کی مختلف وجوہ ہوتی ہیں۔کہیں رسوم و رواج کی پاسداری کی خاطر تو کہیں جہیز نہ ہونے کی بنا پر ایسا کیا جاتا ہے۔کہیں اپنے معیار کا بر نہ ملنے کا جواز ہوتا ہے تو کہیں خاندانی جھگڑے اور جھوٹی انائیں اس امر کا باعث بنتی ہیں۔اس کی سب سے تکلیف دہ صورت یہ ہے کہ بعض اوقات جوان لڑکیوں کو چھوٹی عمر کے لڑکوں سے منسوب کر دیا جاتا ہے اور پھر ان کے بڑے ہونے کے انتظار میں لڑکیوں کو قید کر کے بٹھا دیا جاتا ہے۔اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر لڑکیاں چھوٹی عمر میں بیوہ ہو جائیں تو انھیں عقد ثانی کی اجازت نہیں دی جاتی یا انھیں اتنی آزادی نہیں دی جاتی کہ وہ اپنی مرضی سے عقد ثانی کر سکیں۔ایسی صورت میں بھی انھیں بہت سی حدود قیود اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان کی عمر نکلتی رہتی ہے اور وہ اندر ہی اندر جلتی کڑھتی نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔معتوب کے اس کردار کی مدد سے معاشرے کے اس مجرمانہ رویے پر تنقید کی گئی ہے۔ مصنف نے اس کا بیان بہت معنی خیز اور علامتی انداز میں کیا ہے۔اس کے لیے کلام مقدس (انجیل) سے تامار کے واقعے کو بطور تلمیح برتا گیا ہے۔تامار ایک خوب صورت جوان بیوہ عورت تھی،شوہر کے مر جانے کے بعد سسر نے اسے عقدِ ثانی کی اجازت نہیں دی اور چھوٹے دیور کے بڑے ہونے کے انتظار میں بٹھا دیا،لیکن ظلم یہ کیا کہ جب لڑکا جوان ہو گیا تب بھی تامار کی اس کے ساتھ شادی نہ کی۔تامار اس زیادتی سے بہت دکھی ہوئی اور داخلی بحران نے اسے سسر سے انتقام لینے پر مجبور کر دیا۔غم و غصے اور انتقام کی آگ میں جل کر اسے کیتھارسس کا یہی طریقہ ملا کہ وہ امیدوار بن کر شہر کے چوراہے میں بیٹھ گئی۔اتفاقاً سسر کا جب اس راہ سے گزر ہوا تو وہ خلوت کا متمنی ہوا اور حق خدمت کے طور پر ایک بکری کا بچہ دینے کا وعدہ کیا،مگر فوری طور پر بکری کا بچہ پاس نہ ہونے کے باعث اپنی خاتم،ڈوری اور عصا بطور ضمانت دیے۔(۶) کلامِ مقدس کی اس تلمیح کو ہیروئن کی نفسیاتی کیفیت پر منطبق کیا گیا ہے۔یہ کلام سن کر ہیروئن کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ شہر کے چوراہے میں بیٹھی تامار ہے اور اس نے بہت سی خاتم اور ڈوریاں جمع کر لی ہیں اور اس کے گرد بہت سے بکری کے بچے ممیا رہے ہیں۔(۷) جنس کے لیے یہ استعارہ مصنف نے بڑی عمدگی سے استعمال کیا ہے اور پورے ناول میں بڑی مہارت سے اس کا اعادہ کیا ہے۔ناول کی ہیروئن کا اپنے بارے میں بولا ہوا یہ سچ کہ وہ تامار ہے اور چوراہے میں بیٹھی ہے،ہمارے معاشرے کے بہت سے رویوں پر سوال اٹھاتا ہے۔چوراہے میں بیٹھی عفت بیچنے والیوں کے پیچھے چھپی ناآسودہ کہانیوں کو پڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔تانیثیت میں عورت کی طرف سے معاشرے کے ایسے ہی رویوں اور اقداری پیمانوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے جن میں عورت کو بطور فرد سمجھنے میں غلطی کی جاتی ہے اور اسے گوشت پوست کا زندہ انسان سمجھنے کے بجائے گاے بکری تصور کر لیا جاتا ہے۔اس کی جذباتی اور جسمانی تسکین کی ضرورت کو نظر انداز کر دیا

جاتا ہے۔تانیثیت عورت کی جذباتی گھٹن اور جسمانی نا آسودگی سے پیدا ہونے والے مسائل کا ذمے دار سماجی اداروں کو ٹھہراتی ہے۔ناول کی ہیروئن یہ سمجھتی ہے کہ آج وہ جس حال کو پہنچی ہے وہ معاشرتی رویوں کا پیدا کردہ ہے۔

تانیثیت کا ایک رویہ یہ بھی ہے کہ یہ عورت کی بطور فرد پہچان اور شناخت کا مطالبہ کرتی ہے۔مروجہ معاشرتی پیمانوں کے مطابق عورت کی اپنی کوئی پہچان نہیں ہے وہ ہمیشہ مرد کے توسط سے پہچانی جاتی ہے۔تانیثیت عورت کی شناخت کے حوالے سے کسی قسم کی اجارہ داری اور تسلط کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے اور عورت کو ذات پات، قبیلے اور خاندان کے لیبل سے آزاد کر کے بطور فرد اور بطور معاشرتی رکن کے پہچان کرنے پر زور دیتی ہے۔ یہ تانیثی رویہ مابعد جدیدیت کے بہت قریب ہے، یہاں مابعد جدیدیت اور تانیثیت کے باہم اشتراکات کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ثقافتی، مذہبی اور معاشرتی اجارہ داریوں کی تردید کا یہ وہی رویہ ہے جس کا اظہار مابعد جدیدیت بڑی شد و مد سے کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت تسلیم شدہ، روایتی نظریات اور اقدار وضوابط کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس قسم کے تصورات کی کلیت، حتمیت اور آفاقیت کو رد کرتی ہے۔نسلی، ثقافتی اور مذہبی اکائیوں اور گروہوں کے احیا پر زور دیتی ہے۔۔کسی بھی غالب عقلی نظام کو قبول نہیں کرتی کیوں کہ اس طرح کے نظام دوسرے نقطہ ہائے نظر کو دبانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔یہ اختلاف اور کثرتیت کی قائل ہے اور ایسے تمام سماجی گروہوں کی حمایت کرتی ہے جنھیں رنگ، نسل، جنس اور صنف کی بنا پر تقسیم کیا جاتا ہے، غیر سمجھا جاتا ہے، ان کا استحصال کیا جاتا ہے اور انھیں انسانی دائرے سے باہر شمار کیا جاتا ہے۔اس طرح مابعد جدیدیت تانیثیت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کل تانیثیت کو مابعد جدیدیت کا ہی حصہ تصور کیا جاتا ہے۔(۸) ناول میں شناخت کے اس مسئلے کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ہیروئن جب اعتراف کے لیے پادری کے سامنے پیش ہوتی ہے تو وہ کاغذی کارروائی کے لیے اس سے نام و پتا دریافت کرتا ہے اور مذہب کے بارے میں سوال کرتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے۔

میرا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہے۔میں نے اپنے ماں باپ کے مذہب کو اپنے عقل سے پرکھنے کی کوشش کی پھر اس میں اپنی پسند کی ترمیم کی... میں اپنا نام بتائے بغیر اور مذہب کے بارے میں اپنا نظریہ بدلے بغیر اگر اپنا کنفشن نہیں دے سکتی تو پھر میں یہ سمجھوں گی کہ مذہب دو طرفہ عمل ہے اور خدا اس کی سنتا ہے جو خدا کا حکم مانتا ہے۔(۹)

عورت کا یہ جواب مابعد جدید عہد کی اس عورت کا اظہار یہ ہے جو معاشرے کے طے کردہ معیارات اور ضابطوں کو ماننے سے منحرف ہے۔وہ ان شناختوں کو اپنی آزادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہے جو پیدائشی طور پر اس سے وابستہ ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے معیار خود وضع کرنا چاہتی ہے اور اپنے فیصلے آپ کرنا چاہتی ہے۔زندگی کو اپنے تجربے سے جینا چاہتی ہے... نیکی اور بدی کا میرا اپنا کوڈ ہے... میں جو کچھ صحیح سمجھتی ہوں میرے نزدیک وہی نیکی ہے... کیا گناہ ہے اور کیا

ثواب ہے اس کا انحصار میرے ضمیر کے فیصلے پر ہے۔ گناہ یا بدی اور نیکی کی مروجہ اصطلاحات کو میں تسلیم ہی نہیں کرتی۔(۱۰)

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ پورے ناول میں اس عورت کا کوئی نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ عورت کو یوں بے نام حیثیت سے پیش کر کے مصنف نے عورت کی اس مزاحمت کی عکاسی کی ہے جس کے مطابق وہ روایتی شناختوں سے منحرف ہو رہی ہے۔ مابعد جدید عہد کی عورت کا یہ انحراف صدیوں کے تاریخی اور تہذیبی عمل کا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ ایک ایسا ردعمل ہے جو معاشروں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے، بالخصوص ہمارے جیسے حبس زدہ معاشرے میں اگر عورت اور مرد کے حقوق اور استحقاق کے مابین صحت مند توازن قائم نہ کیا گیا اور عورت کے وجود کو حقیقی بنیادوں پر تسلیم نہ کیا گیا تو ردِعمل اور انحراف کی کارروائی تباہ کن اور مریضانہ صورت حال پر منتج ہو سکتی ہے۔ (جس کے اثرات یورپی معاشرے میں بالعموم اور ہمارے معاشرے میں بالخصوص نظر آنے شروع ہو چکے ہیں، مثال کے طور پر ۲۰۱۹ء کے عالمی یومِ نسواں پر پاکستانی خواتین کی طرف سے کیا گیا مظاہرہ)

تانیثیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ عورت کے مساویانہ حقوق کو یقینی بنانے پر زور دیتی ہے۔ خاندانی، وراثتی، سماجی، سیاسی، قانونی اور اخلاقی سطح پر ان تمام حقوق اور مراعات کا تقاضا کرتی ہے جو کسی معاشرے میں عورت کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کا یہ عمومی رویہ ہے کہ عورت کو عورت ہونے کی وجہ سے بہت سے استحقاق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ تعلیم، ملازمت، رشتہ داری، شریک حیات کا انتخاب، وراثتی معاملات جیسے اس کی زندگی کے اہم فیصلوں میں اس کی ذات اور اس کی رائے کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایسے میں مشرق کی عورت عمومی طور پر سمجھوتہ کرتی چلی آئی ہے لیکن دور حاضر کی عورت اب یہ سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتی۔ ردعمل کے طور پر اب وہ معاشرے کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے اور ان تمام محاذوں پر عملی سطح پر مزاحم ہے۔ ناول کی یہ ہیروئن بھی ایک ایسی ہی عورت کا کردار پیش کر رہی ہے جو عملی سطح پر معاشرے کے خلاف مزاحمت اور بغاوت کا رویہ رکھتی ہے۔ وہ معاشرتی ضابطوں اور پابندیوں کو توڑ کر باقاعدہ لذت محسوس کرتی ہے۔ وہ خاندان اور شادی جیسے بندھن کو بھی اپنے لیے جکڑ بندی سمجھتی ہے۔ وہ ایک پٹھان فوجی نوجوان سے محبت کرتی ہے اور اس کے ساتھ رہنے لگتی ہے لیکن جیسے ہی وہ اسے شادی کی پیش کش کرتا ہے اور روایتی بیوی بنا کر گھریلو زندگی کی ترغیب دیتا ہے تو وہ اسے چھوڑ کر فرار ہو جاتی ہے۔ وہ معاشرے کے اس رویے پر تنقید کرتی ہے کہ یہاں عورتیں مرد کی مرضی کی تابع ہوتی ہیں۔ محبت جیسا نازک اور لطیف معاملہ بھی مرد حاوی معاشرے کی اجارہ داری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا، محبت کے نام پر مرد عورت کو ہمیشہ کے لیے غلام بنانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ سوال اٹھاتی ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو انتخاب کا حق کیوں نہیں ہے؟ جس طرح مرد محبت اختیار کرنے اور اسے ترک کرنے میں آزاد ہیں اسی طرح عورتیں بھی محبتیں اور وفاداریاں اختیار کرنے اور ترک کرنے کا حق رکھتی ہیں۔ اگر مرد کسی عورت سے اظہارِ محبت

کرے یا اسے شادی کی پیش کش کرے تو ضروری نہیں کہ عورت بھی جواب میں اس سے محبت کرے یا اس کی پیش کش قبول کر لے۔ مرد آخر یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ اگر کسی لڑکی سے شادی کی خواہش کا اظہار کریں گے تو وہ ان کی اس خواہش پر مر مٹے گی۔ کاش یہاں کے لوگ عورت کو اپنی ملکیت سمجھنا چھوڑ دیں، عورتیں انگوٹھیاں نہیں ہیں وہ ٹیپ ریکارڈر یا نیا سوٹ بھی نہیں ہیں۔ وہ گوشت پوست کی انسان اور ایک الگ اکائی ہیں۔ وہ پسند کرنے کا حق رکھتی ہیں اور اپنی غلط پسند کو رد کرنے کا بھی حق رکھتی ہیں اور یہ حق دونوں کو برابر ملنا چاہیے۔(۱۱)

اس ضمن میں وہ اس رویے کو بھی تنقید کا نشانہ بناتی ہے کہ شادی جیسے معاملے میں مرد چاہتے ہیں کہ عورت ان کی مرضی کے مطابق ڈھل جائے۔ ان کی زبان سیکھ لے، ان کا کلچر اپنا لے اور ان کے ماحول میں رنگ جائے لیکن خود مردوں نے عورت کے لیے اپنا آپ تبدیل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ میجر راجو سے اس لیے شادی سے انکار کر دیتی ہے کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کی زبان سیکھ لے اور اس کے گاؤں میں رہے۔ ''کاش راجو مجھے سمجھ سکتا اور جو کچھ میں اسے دے رہی تھی اسی کا شکر گزار رہتا تو میں اس سے خوف زدہ ہو کر نہ بھاگتی... تمھیں اپنے گھر آنگن، اپنے بستر اور بچوں کے لیے روبوٹ کی ضرورت تھی اور میں روبوٹ نہ تھی۔ میں سچ مچ اور گوشت پوست کی زندہ عورت تھی اس لیے تم سے شادی پر رضامند نہ ہو سکتی تھی۔''(۱۲)

اس کردار کی مدد سے یہ دکھایا گیا ہے کہ معاشرے کے اس غیر منصفانہ رویے اور صنفی امتیاز کی بنا پر عورت میں اس کا شدید ردعمل برآمد ہوا ہے اور نتیجے کے طور پر وہ ہر اس معاشرتی اکائی سے مزاحم ہو گئی ہے جس میں کسی حاکمیت اور اجارہ داری کا پہلو نکلتا ہے اور جس میں اس کے انضمام ذات کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ ''میں نے ہر ایسی چیز کو رد کر دیا جو میری راہ میں دیوار بن جائے''۔ کردار کے اس رویے پر مابعد جدیدیت سے متاثر تانیثیت کے بڑے واضح اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں جس کے نتیجے میں عورت خاندان، گھر، رشتۂ ازدواج اور اولاد کی پرورش جیسی سماجی ذمے داریوں سے منحرف ہونے لگی ہے۔ (اگرچہ اس رویے کے بہت سے پہلو قابلِ بحث ہیں اور اس میں بھی توازن لانے کی ضرورت ہے)۔ آزادی جیسے استحقاق کے حصول کے لیے عورت کا یہ رویہ اس قدر شدید ہو چکا ہے کہ بغاوت معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس نے شادی جیسے سماجی عمل سے وابستہ کمزوریوں، تضادات، کھوکھلے پن اور منافقت پر سخت تنقید کی ہے اور سماج کے دہرے معیارات کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس کا یہ رویہ معاشرے کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر شادیاں سمجھوتے کی پیداوار ہوتی ہیں اور کسی ذہنی اور جسمانی قربت کے فقدان کے باعث لوگ عمر بھر ایک میکانکی زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر شادیاں اس اطمینان اور مسرت سے محروم ہوتی ہیں جو رشتہ ازدواج کا بنیادی مقصد ہے۔ یہ شادیاں محض رسم کی تکمیل تک محدود ہوتی ہیں۔ اکثر مرد گھروں سے باہر کئی کئی عورتوں سے

تعلقات رکھتے ہیں اور گھر کی عورت کو اس استحقاق اور مسرت سے محروم رکھتے ہیں۔ وہ مردانہ معاشرے کے اس جبر کے سخت خلاف ہے جس کے تحت نہ تو شادیوں کے فیصلے سنجیدگی سے کیے جاتے ہیں اور نہ ہی شادیوں کو سنجیدگی سے نبھایا جاتا ہے... اگر شوہر اپنے ہی بیڈ رومز اور بستروں کی فضا اپنی بیویوں کے لیے دباؤ سے آزاد کر دیں... تو بازار چند دنوں میں اجڑ جائیں اور گھروں کے جہنم جنت میں تبدیل ہو جائیں۔[۱۳] وہ اس منافقت کے خلاف شدید احتجاج کرتی ہے کہ اگر مرد بیویوں کے ہوتے ہوئے دوسری عورتوں سے تعلقات استوار کر سکتے ہیں اور ان کے ساتھ ہوٹلوں میں گھوم سکتے ہیں تو پھر بیویوں کو یہ حق کیوں حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی محرومیوں کا ازالہ کر سکیں اور دوسرے مردوں سے مل کر مسرتیں سمیٹ سکیں۔ اس مسرت پر مرد کے ساتھ ساتھ عورت کا بھی برابر کا حق ہے۔[۱۴] وہ یہ سوال بھی اٹھاتی ہے کہ آخر یہ کیسا معیار ہے کہ ان تمام منافقتوں کے باوجود مرد معاشرے سے پوری عزت اور سماجی رتبہ وصول کرتے ہیں لیکن جب عورت ایسا کرتی ہے تو اسے بے وفا کہا جاتا ہے اور اس کے کردار پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ معاشرے کی طرف سے مرد کو عطا کردہ یہ مراعات اور تحفظات محض مرد ہونے کے جواز پر کسی طور بھی قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی سماجی قاعدہ اور ضابطہ کسی بات پر گرفت کرتا ہے تو اس کا اطلاق عورت اور مرد دونوں پر یکساں ہونا چاہیے۔

ناول میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کردار کے یہ خیالات شروع سے ہی ایسے نہیں تھے۔ ابتدائی طور پر وہ بھی عام سی روایتی لڑکی تھی لیکن جیسے جیسے زندگی کے تجربات سے دو چار ہوئی معاشرتی رویوں نے اس کی سوچ کو رفتہ رفتہ اس نہج پر پہنچا دیا کہ وہ معاشرے سے بغاوت پر اتر آئی۔ اس کی زندگی کا پس منظر اور حقائق اس بات کے غماز ہیں کہ زندگی میں آنے والے اتار چڑھاؤ اس پر غیر معمولی طور پُراثر انداز ہوئے اور نتیجتاً وہ غیر معمولی عورت بن کر ابھری۔ اس نے دو مرتبہ شادی کی اور روایتی عورت کی طرح گھر بسانے کی کوشش کی لیکن دونوں مرتبہ اس کا تجربہ ناکام ہوا۔ اس کا اعتماد بُری طرح مجروح ہوا اور ردعمل کے طور پر وہ اس راستے پر چل پڑی جہاں سے واپسی کے امکانات نہیں تھے۔ اس نے پہلی مرتبہ جب شادی کی تو وہ اسکول کی طالبہ تھی اور اسکول آتے جاتے اپنے سے دگنی عمر کے ایک والی بال کوچ کے دام عشق میں گرفتار ہو گئی۔ سردار بازاری عورتوں کا رسیا، تجربہ کار اور ایک گھاگ مرد تھا اس لیے اسے لڑکی کو شیشے میں اتارنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ لڑکی ایک گھٹن زدہ مفلوک الحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور گھر کے حالات سے نالاں تھی ایسے میں سردار اسے جنت کا شہزادہ معلوم ہوا اور وہ اس کی بیوی بن گئی اور اس کے بچے کی ماں بھی۔ لڑکی کی ذات اور اس کی زندگی پر سردار نے گہرے اور ان مٹ نقوش چھوڑے اور زندگی بھر وہ سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح آنکھیں بند کر کے اسی ڈگر پر چلتی رہی جس پر سردار نے اسے ڈال دیا تھا۔ سردار نے اس کے اندر ایک ایسی عورت کو پروان چڑھایا جو مردوں کی کمزوریوں سے واقف تھی، مردوں کو مفتوح کرنے کا گر سیکھ گئی تھی اور جو جسم کو کل کائنات سمجھ بیٹھی تھی اور زندگی کا

سفر بدن کے راستے سے طے کرنا اپنا کمال سمجھتی تھی۔ گھٹن اور حبس کے پس ماندہ آنگن میں پلنے والی کچی لڑکی کے جذبات سے فائدہ اٹھا کر سردار اپنی بھوک مٹانے کی غرض سے جب اسے نام نہاد رشتہ ازدواج میں باندھ کر گھر لے آیا تو اس نے اپنے ''تجربات'' کی روشنی میں ایسے خطوط پر اس کی تربیت کی گویا بازار کے لیے تیار کی گئی ہو۔ اس نے ایک ایسی بھوک اسے منتقل کی جس کے مداوے کے لیے وہ زندگی بھر نئے سے نئے شکار کی تلاش میں رہی۔ دراصل یہ مردانہ معاشرے کی وہ بھوک ہے جس کے نتیجے میں صدیوں سے عورت کا استحصال ہوتا چلا آیا ہے۔ سردار سے اس کی یہ شادی محض چند برسوں میں اپنے منطقی انجام کو پہنچی اور علاحدگی پر منتج ہوئی۔ یہ ازدواجی بندھن اس اخلاص، محبت، دیانت داری اور وفا سے محروم تھا جو اس رشتے کے لیے ضروری ہے لہٰذا ایک نوعمر لڑکی جب ایک تجربہ کار عورت کے روپ میں منقلب ہوئی تو اس کے دل میں مردوں کے خلاف شدید نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کے اس انتقامی ردعمل کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سردار نے شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد سابقہ روش اپنا لی تھی اور دوسری عورتوں میں دل چسپی لینے لگا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سماجی ضابطوں اور بندھنوں کو بالائے طاق رکھ کر آزادی کا مطالبہ کرنے والی یہ عورت پیدائشی طور پر ایسی نہیں ہے، معاشرے سے اس کی یہ بغاوت اور مزاحمت خود معاشرے کی پیدا کردہ ہے۔ ابتداً اس کے اندر بھی ایک روایتی عورت پنہاں تھی اور سردار سے شادی کے بعد اس نے بالکل روایتی عورتوں کی طرح گھریلو زندگی بسر کرنا شروع کر دی تھی لیکن رشتے میں اخلاص کی محرومی اور سردار کے بازاری پن اور بے وفائی نے اسے ردعمل پر مجبور کیا۔ یہی ردعمل نئے راستے کا پہلا قدم ثابت ہوا۔ اس کے باوجود بھی وہ زندگی بھر سردار کو یاد کرتی رہی۔ اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتی رہی اور اس کے کھونے پر پچھتاتی رہی۔ اس کا یہ رویہ اس کے زندہ انسان ہونے کی دلالت کرتا ہے اور اس کے اندر چھپی ہوئی فطری عورت کی دریافت کرتا ہے۔(۱۵)

سردار کے گھر سے نکلنے کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر شادی کی۔ اس شادی کے لیے اس نے ایسے شخص کا انتخاب کیا جس کا ماضی بے عیب نہ تھا اور جو بازاری عورتوں کا مرد تھا۔ عورت کا خیال تھا کہ اپنی کمزوریوں کے باعث دونوں نظریہ ضرورت کے تحت ایک دوسرے کے لیے اچھے شریک حیات ثابت ہوں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ابتداً یہ شادی کامیاب رہی اور وہ بالکل روایتی بیوی بن کر گھر اور بچوں کو سنبھالنے لگی لیکن جیسے ہی اس کا شوہر ملازمت کے سلسلے میں بیرون ملک گیا وہ اپنی روش پر قائم نہ رہ سکی اور اس کے اندر کی عورت زندہ ہو گئی اور آزادی کی لہر اس کے اندر کلبلانے لگی۔ وہ ان شوہروں کو تنقید کا نشانہ بناتی ہے جو بیویوں کو معاشرے کے رحم و کرم پر چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں چلے جاتے ہیں۔ ایسی عورتیں زیادہ دیر خود پر بند باندھ کر نہیں رہ سکتیں اور انھیں ٹھوکر لگ جاتی ہے بالخصوص اس جیسی عورت جو جسمانی لذتوں سے محظوظ ہو چکی ہو اور جسم کے ساتھ ذہن بھی رکھتی ہو زیادہ دیر تک خطوں کے سہارے جینے کا جبر نہیں

سہہ سکتی۔ مرد تھوڑے سے پیسے بھیج کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور عورت ساری زندگی خود کو تج کر بچوں کی آیا بنی رہتی ہے۔ وہ اس نا انصافی کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور معاشرتی اخلاقیات کو رد کرتے ہوئے اپنے دوست کو گھر بلا لیتی ہے۔[۱۶] حقیقت یہ ہے کہ سردار کے گھر سے جب وہ انتقام اور بھوک کی آگ میں جل کر نکلی تو پھر راستے میں اس کے قدم کہیں نہ جم سکے۔ اس نے پے در پے مردوں کو شکار کیا، اس نے رشتے اور روپ بدل بدل کر مردوں کو برتا، کہیں دوست بن کر، کہیں محبوبہ، کہیں بیوی، کہیں کولیگ اور کہیں سیل گرل بن کر۔ شروع شروع میں اس نے انتقاماً ایسا کیا، پھر اسے لذت ملنے لگی اور بعد ازاں یہ اس کی مجبوری بن گئی اور وہ ایسی نفسیاتی بھوک کا شکار ہوئی جو کبھی نہ مٹ سکی۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اسے جنسی طور پر نا آسودہ ایک ایسی عورت قرار دیتے ہیں جو بہ یک وقت کئی عورتوں میں ڈھل چکی ہے۔[۱۷]

مصنف نے اس صورت حال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورت کا جسم کی سطح پر آزادی کا یہ مطالبہ دراصل اس جسمانی استحصال کا منطقی نتیجہ ہے جو انسانی معاشروں میں عورت کے ساتھ روا رہا ہے۔ عورت کے وجود اور کردار کو نظر انداز کر کے اسے محض جسم سمجھا جاتا رہا نتیجتاً عورت جسم کی اہمیت سے روشناس ہوئی۔ ردعمل کے طور پر اس نے اس جسم کو مردوں کے خلاف استعمال کرنے کا آلہ کار بنالیا۔ یہ اس جذباتی محرومی کا بھی منطقی انجام ہے جس کے تحت عورت رشتوں کا بھرم رکھتے رکھتے جذباتی اور جنسی محرومی کا شکار ہوتی رہی۔ گھروں کی چار دیواریوں میں محصور عورتوں کی جذباتی زندگی سے قطع نظر مرد اپنی جسمانی آزادی سے بہرہ ور ہوتے رہے اور عورت کی جسمانی نا آسودگی رفتہ رفتہ مرض کی شکل اختیار کرتی چلی گئی۔ مردانہ معاشرے کی اس منافقت، ریاکاری اور نا انصافی کا نتیجہ عورت کی نفرت اور بغاوت کی صورت میں برآمد ہوا ہے اور عورت جسمانی سطح پر آزادی اور ضابطہ اخلاق کی پابندی سے انحراف کا نعرہ لگا رہی ہے۔ وہ اپنے جسمانی استحصال کو ہی اپنی ڈھال بنانے پر مجبور ہے۔ ناول کا یہ کردار بھی ایسی ہی عورت کی نمائندگی کرتا ہے جس پر اس صورت حال کا ردعمل اتنی شدت سے مرتب ہوا ہے کہ نتیجتاً وہ مردوں کے جذبات کو مجروح کرنا چاہتی ہے، ان سے بے وفائی کرنا چاہتی ہے، انھیں جذباتی شکست دے کر اسے لذت ملتی ہے، وہ کسی ایک کی ہو کر نہیں رہنا چاہتی۔ ایک سے ایک پُرغرور مرد کی انا کے بت کو توڑنا اس کا دل پسند مشغلہ بن جاتا ہے۔ اس کا یہ رویہ بعض اوقات اتنی شدت اختیار کر جاتا ہے کہ وہ قابل رحم ہو جاتی ہے اور مریض بن جاتی ہے۔ ''جو سچی محبت کرتے ہیں ان سے بے وفائی کی لذت ہی کچھ اور ہے... کیسے کیسے لوگ کہاں کہاں بچھڑ گئے یہ سچ مچ کس قدر ایکسائٹنگ ہے۔''[۱۸] ظاہر ہے کہ ایسے عمل میں گھر، خاندان اور اولاد جیسی زنجیریں سد راہ بن جاتی ہیں۔ وہ میجر راجو کی تمام تر محبت کے باوجود اسے اسی لیے رد کر دیتی ہے کہ وہ اسے بیوی بنا کر سونے کے پنجرے میں قید کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ کسی بھی قیمت پر اپنی آزادی کھونا نہیں چاہتی تھی۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے بقول ہمارے ناول میں ایسی عورت خال خال ہی پائی جاتی ہے... وہ اسے انتہائی سخت جان

عورت قرار دیتے ہیں جسے الفاظ کی سطح پر جیتنا ناممکن ہے۔[۱۹]

اس لیے جب یہ عورت محبت میں آفاقیت کا نظریہ پیش کرتی ہے تو ہمیں بالکل حیرت نہیں ہوتی۔ جدید معاشرے کی ریاکارانہ، مادہ پرستانہ اور کمرشل ذہنیت کے تناظر میں وہ معاشرے کو ایک نئی عورت سے متعارف کرواتی ہے جو محبت اور وفاداری کے مادی اور حقیقت پسندانہ نظریے پر یقین رکھتی ہے۔ اس کے خیال میں محبت اور جنس دو الگ الگ اکائیاں ہیں۔ محبت اور جسمانی تعلق کسی ایک ہی فرد سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اور بہ یک وقت دو الگ الگ اشخاص سے بھی۔ کسی شخص سے دائمی اور مستقل محبت اور رفاقت رکھی جا سکتی ہے اور کسی وقتی اور جزوی مسرت کے لیے کسی دوسرے کا انتخاب بھی کیا جا سکتا ہے، عارضی اور لمحاتی تعلق لمحوں میں ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگر عورت دائمی اور مستقل طور پر کسی مرد کی رفیق ہے اور وقتی مسرت کے لیے کسی دوسرے مرد پر انحصار کرتی ہے تو اس پر بے وفائی کا الزام لگانا بے بنیاد ہے۔ ''ہمارے لوگ اس بالغ نظری سے آگاہ ہی نہیں ہو سکے جس کی آخری سرحدوں تک جا کر عورت محبت کر سکتی ہے۔''[۲۰] اس کا یہ جدید نظریہ محبت و رفاقت کا سبق مردانہ معاشرے کی جدید کاروباری اور ضرورت پرستانہ سوچ کا پروردہ معلوم ہوتا ہے۔

اس ضمن میں وہ یہ اعتراض بھی اٹھاتی ہے کہ کھوکھلے اور منافقانہ کرداروں کے حامل یہ مرد اپنی داخلی کمزوری اور خوف کو چھپانے کے لیے الٹا عورتوں پر شک کرتے ہیں۔ یہ معاشرے کی بے اطمینانی، جنسی گھٹن اور داخلی خوف کا اظہار یہ ہے کہ لوگ یہاں عورت پر شک کرتے ہیں اور اسے طرح طرح کی جکڑ بندیوں میں پابند رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ مرد حاوی معاشرے کی اس مریضانہ ذہنیت کا عکاس ہے جس کے نتیجے میں انھیں یقین ہوتا ہے کہ اگر عورتیں گھروں سے باہر نکلیں گی تو مردانہ چیرہ دستیوں سے بچ کر صحیح سلامت واپس نہ آسکیں گی۔ یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اگر اس کے باوجود بھی عورت اپنی عفت و کردار کو محفوظ و مامون لے کر گھر لوٹتی ہے تو یہ اس کی عظمت ہے۔ ناول کی ہیروئن اس بات پر سخت احتجاج کرتی ہے کہ یہاں عورت کے وقار اور عزت نفس کو مجروح کیا جاتا ہے اور اسے ہمیشہ بکاؤ مال اور پکا ہوا پھل سمجھا جاتا ہے جو دوسروں کی جھولی میں گرنے کے لیے بے تاب ہے... لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیویاں گھر سے ذرا قدم باہر نکالیں گی تو آوارہ ہو جائیں گی اور دوسرے مرد انھیں اپنی خواب گاہوں میں لے جائیں گے اور وہ چپ چاپ چلی جائیں گی جیسے وہ انسان نہیں جانور ہیں... اور ان کی طرف جوٹھی لوٹیں گی۔[۲۱]

ناول میں عورت کو بکاؤ مال سمجھنے کے رویے کا اظہار ایک اور صورت حال سے بھی کیا گیا ہے۔ ناول کی ہیروئن جب ضرورت کے تحت اپنی سہیلی کے گھر میں قیام کرتی ہے تو سہیلی کا باپ اسے بڑا تحفظ فراہم کرنے اور مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ مگر یہ وعدہ کسی اخلاص اور نیک نیتی پر مشتمل نہیں ہے۔ اس نے ہیروئن کو پیش کش کی کہ وہ ایک بڑی رقم اسے

مہر میں دینے کو تیار ہے اور اگر وہ بطور مہر یہ رقم نہیں لینا چاہتی تو اس کے بغیر بھی یہ رقم محض اس ''خوشی'' کی خاطر دی جاسکتی ہے جو وہ اسے فراہم کرسکتی ہے۔۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنی سہیلی کے باپ کی مرضی کے خلاف ایک دن بھی اس گھر میں نہ رہ سکتی تھی... اس گھر سے نکل کر سر دست کہیں اور جا بھی نہ سکتی تھی۔۔ چناں چہ میں (نے اس کے) باپ سے عصا، خاتم اور ڈوری بھی قبول کر لی... تحفظ حاصل ہو گیا۔(۲۲)

اس رویے کی عکاسی ناول میں ایک اور مقام پر بھی کی گئی ہے۔ ہیروئن جب قتل کے بعد عدالت میں لائی جاتی ہے تو اس موقع پر عدالت میں موجود تمام مرد اسے ایسے دیکھتے ہیں جیسے وہ کوئی تفریح کی چیز ہو... کمرے میں بیٹھے وکیل اسے آنکھوں سے آنک رہے تھے اور اسے اور امروز کو ایک ساتھ اس کے بیڈروم میں دیکھ رہے تھے اور خیالوں میں اسے بے لباس دیکھ رہے تھے۔ان کے ہاتھوں پر ضعف اور تصور کی شدت کی وجہ سے پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔(۲۳) اس سے ہمارے معاشرے کہ اس رویے کی عکاسی ہوتی ہے کہ یہاں پر مرد عورت پر رائے زنی کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور عورت چاہے جتنی ہی اچھی اور پارسا کیوں نہ ہو اس کے وجود سے ایک خاص قسم کی سنسنی وابستہ کر دی جاتی ہے۔ اگر یہ عورت تعلیم یافتہ، ملازمت پیشہ ہو یا کسی نمایاں کردار کی حامل ہو تو معاشرے کا یہ رویہ اور شدید ہو جاتا ہے۔ ایسی عورتوں کو اور زیادہ موضوع بحث بنایا جاتا ہے اور لوگ ان کا ذکر کر کے ان سے کہانیاں منسوب کر کے اپنی نا آسودہ خواہشوں کی تسکین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ناول میں اس عورت کا کردار انتہائی غیر معمولی اور پیچیدہ صورت میں پیش کیا گیا ہے۔کئی متضاد قسم کے رویے اور اتار چڑھاؤ اس کی شخصیت میں یک جا ہو گئے ہیں اور اس کی شخصیت کو سمجھنا مشکل ہو گیا ہے۔وہ کم عمری میں جن تجربات سے گزری وہ اس کی شخصیت پر گہرا اثر چھوڑ گئے۔بظاہر وہ معاشرے کے بنے ہوئے نظام میں ڈھلتی چلی گئی اور اسے اپنی محرومیوں، ضرورتوں اور مجبوریوں کے لیے ذریعہ کار بنایا لیکن در پردہ وہ اس نظام سے مزاحم رہی اور انتقاماً اپنے استحصال کو عیش ونشاط اور آزادی کا رنگ دے کر قبول کرتی رہی۔رفتہ رفتہ وہ مابعد جدید معاشرے کے میٹرو پولیٹن کلچر کا حصہ بن گئی اور جدید صنعتی، میکانکی، ریاکارانہ اور مادہ پرستانہ سماج کے سارے داؤ پیچ اس نے سیکھ لیے۔اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، یونی ورسٹی میں ملازمت کی، مصورہ بنی اور شہرت حاصل کی۔دو شادیاں کیں اور دونوں شوہروں سے علاحدگی اختیار کی، بڑے شہر میں دو بچوں کے ساتھ تنہا رہنے لگی، مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھا، پارٹیاں، ڈانس، کلب، شاپنگ اور آؤٹنگ جیسی تمام سرگرمیاں اپنا لیں، لڑکے کو تعلیم کے بہانے بیرون ملک بھیجا لڑکی کو بیاہ دیا اور اس طرح ''مکمل آزادی'' حاصل کی۔ پہلے مرد سے لے کر آخری تک اس کی زندگی میں تقریباً بیس مرد آئے وہ سب کو ان کی ضرورت و افادیت کی بنا پر اپناتی اور ترک کرتی رہی جیسے ضروریات زندگی کی دیگر اشیا حاصل کی جاتی ہیں، استعمال کی

جاتی ہیں اور ضرورت پوری ہونے پر پھینک دی جاتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ کلچر کا یہ وہی رویہ ہے جس میں فرد کو بھی ایک شئے تصور کیا جاتا ہے اور سماجی منظر نامے میں عورت بھی ایک شئے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اس لیے عورت کا مردوں کے متعلق یہ رویہ معاشرے کو آئینہ دکھانے کی ایک کوشش ہے۔ اس کے کردار کی مدد سے معاشرے کی اس منافقت کا پردہ چاک کیا گیا ہے کہ یہاں ترغیبات کے جال بچھائے قدم قدم پر مرد عورتوں کے شکار میں گھات لگائے بیٹھے ہیں، کہیں تعلیم کہیں ملازمت، کہیں فن اور کہیں دوستی و رفاقت کی آڑ میں، ہر مرد یہ چاہتا ہے کہ عورت اس کی ملکیت ہو کے رہے، ''خالص'' رہے، صرف ایک مرد کی عورت بنے۔ اس کے باوجود ہر مرد دوسری عورت کو ہتھیانے، ورغلانے اور ایکسپلائٹ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ وہ مردوں کی اس کمزوری سے بخوبی واقف ہوگئی تھی اس لیے وہ انھیں صرف اس آدھے سچ پر زندہ رکھتی کہ وہ صرف ایک مرد کی عورت ہے۔ عورت کا یہ رویہ معاشرے کے منافقانہ اور غیر منصفانہ معیارات کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

اگر اس عورت کے کردار اور رویوں کو ان کے محرکات اور پس منظر کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جائے تو ہم پر اس عورت کا حقیقی کردار منکشف ہوتا ہے۔ ہم پر یہ کھلتا ہے کہ معاشرے کے خلاف بقا کی جنگ لڑنے والی اور آزادی کا استحقاق حاصل کرنے والی اس عورت کو اس حق کے حصول کی بڑی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ آخر کار اسے آزادی تو مل گئی لیکن اس آزادی نے اس کے حال اور مستقبل کے لیے بہت سے سوالات پیدا کر دیے۔ وہ تنہائی، نا آسودگی اور پچھتاوے کے کرب کا شکار ہوگئی۔ اسے اپنے والدین، اولاد اور وہ تمام مرد یاد آنے لگے جنھیں وہ خود راستے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاشرے کی چیرہ دستیوں اور ستم ظریفیوں سے شکست خوردہ ایک ایسی عورت ہے جس نے اپنے اوپر مضبوطی اور بہادری کا خول چڑھا رکھا ہے۔ اس لیے جیسے ہی امروز اسے سرائے کا جوتا کہتا ہے جسے سب ہی پہنتے اور تارتے ہیں تو اس کا یہ خول چٹخ جاتا ہے۔ اس کی نسوانی انا بری طرح مجروح ہوتی ہے اور وہ اپنے بارے میں یہ ننگا سچ برداشت نہیں کر سکتی اور خود کو عریاں کرنے والی اس آواز کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ امروز کا قتل کرتی ہے اور اعتراف جرم کے لیے پادری کے سامنے پیش ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ اعتراف دراصل اس کے عورت ہونے کا اعتراف ہے، یہ اس کی شکست کی آواز اور ضمیر کی پکار ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے اندر کی فطری عورت ابھی زندہ ہے۔ وہ عورت جو معاشرے سے حرمت اور تکریم کی خواہاں ہے۔ جب یہ حرمت نہیں ملتی تو پھر وہ اس حرمت کی قربانی دے کر اس کے حصول کی جنگ لڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قتل کی پاداش میں اسے سزا سنائی جاتی ہے تو وہ چیختی ہے کہ اسے سزا نہ دی جائے اس کا علاج کیا جائے۔ بالآخر وہ بھاگ کر نو مین لینڈ چلی جاتی ہے، اس کا خیال ہے کہ وہاں اس سماج کے اصول و قوانین اور معیارات لاگو نہیں ہوتے۔ اس کا یہ اقدام معاشرے کے لیے لمحہ فکریہ ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا

ہے۔ یہ عورت کے معاشرے پر عدم تحفظ، خوف، تشکیک اور انحراف کا واضح اظہار یہ ہے۔ یہ ان ظالمانہ، جابرانہ اور استحصالانہ قوتوں کی نشان دہی کرتا ہے جو عورت کو نو مین لینڈ جانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

ہمارے ہاں عام طور پر عورتوں کی طرف سے اس طرح کے اٹھائے گئے سوالات اور معاشرتی منافقت پر کی جانے ولی تنقید کو بھی منفی انداز میں دیکھا جاتا ہے اور ایکسپلائٹ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس تنقید اور مزاحمت کے پس منظر میں ان اسباب سے عموماً اغماض برتا جاتا ہے جو اس طرح کے غیر معمولی رویوں کے خالق ہیں اور سماج سے اصلاح کے طالب ہیں۔ آج کی عورت کے اس باغیانہ رویے کے بین السطور میں بذات خود یہ بات پنہاں ہے کہ اگر مرد ایسی تمام غیر منصفانہ اور استحصال کنندہ مراعات سے منحرف ہو جائے تو عورت بھی برابری اور آزادی برائے آزادی کی محاذ آرائی سے دستبردار ہو جائے گی اور زندگی توازن اور استدلال کی راہ پر آ جائے گا۔ افسوس کی بات ہے کہ کوئی اس پہلو پر نہیں سوچتا اور معاشرے کی حاکمانہ اور مقتدر قوتیں مراعات، اختیارات، تعیّشات اور استحقاقات کی راہ پر آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ نتیجتاً عورت کا کمپلیکس اور اس کا نفسیاتی خلا بڑھتا جا رہا ہے اور برابری کی کش مکش میں وہ ایکسپلائٹ ہونے پر مجبور ہے اور نتیجتاً عورت کے منصب سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں یہ بھی مردانہ معاشرے کی گھناؤنی سازش تو نہیں۔ (عورت کو اس پر سنجیدگی سے سوچنا چاہیے)

حوالہ جات

1. http.en.oxforddictionaries.com
2. J. A. Cudden, *The penguin Dictionary of Literary Terms and Literary Theory*, 3rd Ed English, p 338.

۳۔ انیس ہارون، ''فیمینزم اور پاکستانی عورت''، مشمولہ ''فیمینزم اور ہم''، مرتبہ فاطمہ حسن، (کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۵

۴۔ فہمیدہ ریاض، ''ردِ تشکیل آخر کیوں''، مشمولہ ''ادب کی نسائی ردِ تشکیل''، مرتبہ فہمیدہ ریاض، (کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۱

۵۔ جولی رفکن اور مائیکل ریان، ''تانیثیت کے نقوش: ایک تعارف''، ترجمہ ارجمند آرا، مشمولہ شش ماہی ''تنقید''، جلد ۲، شمارہ ۱، سرما، ۲۰۰۶ء، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، بھارت، ص ۲۷۱۔۲۶۲

۶۔ امراؤ طارق، ''معتوب''، (مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۲۔۱۱

۷۔ ایضاً، ص ۱۲

۸۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی، ''مابعد جدیدیت (فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں)''، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۱۵۔۲۱۲

۹۔ امراؤ طارق، ''معتوب''، ص ۱۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۷۷، ۶۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۳۔ ایضاً، ص ۶۸
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۲۷
۱۵۔ ایضاً، ص ۳۶
۱۶۔ ایضاً، ص ۷۲
۱۷۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ''آزادی کے بعد اردو ناول''، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۶ء)، اشاعتِ سوم، ص ۴۱۲
۱۸۔ امراؤ طارق، ''معتوب''، ص ۱۰۳
۱۹۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ''اردو ناول کے چند اہم زاویے''، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۶ء)، اشاعت دوم، ص ۳۲۴
۲۰۔ امراؤ طارق، ''معتوب''، ص ۱۳۹
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۲۷
۲۲۔ ایضاً، ص ۶۳
۲۳۔ ایضاً، ص ۳۸۷

مآخذ

۱۔ آفاقی، اقبال، ڈاکٹر، ''مابعد جدیدیت (فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں)''، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۳ء۔
۲۔ حسن، فاطمہ (مرتب)، ''فیمینزم اور ہم''، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء۔
۳۔ ریاض، فہمیدہ (مرتب)، ''ادب کی نسائی ردِتشکیل''، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۶ء۔
۴۔ طارق، امراؤ، ''معتوب''، کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۹۵ء۔
۵۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، ''آزادی کے بعد اردو ناول''، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۶ء، اشاعتِ سوم۔
۶۔ _____، ''اردو ناول کے چند اہم زاویے''، _____، اشاعت دوم۔

رسائل و جرائد

۱۔ رفکن، جولی، اور ریان، مائیکل، ''تانیثیت کے نقوش: ایک تعارف''، ترجمہ ارجمند آرا، شش ماہی ''تنقید''، جلد ۲، شمارہ ۱، سرما، ۲۰۰۶ء، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، بھارت

ویب گاہ

1. http.en.oxforddictionaries.com